درس ۱۲

عائلی زندگی کے بنیادی اصول

سورۃ التحریم کی روشنی میں

(۲)

تربیت اولاد اور والدین کی ذمہ داریاں

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا وَّقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ عَلَیْھَا مَلٰئِکَۃٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَا اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ○ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْیَوْمَ' اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ○ ﴾ (آیات ۶'۷)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اُس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے' جس پر نہایت تُند خُو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے اسے بجالاتے ہیں۔ (اُس وقت کہا جائے گا کہ) اے کافرو! آج معذرتیں پیش نہ کرو' تمہیں تو ویسا ہی بدلہ دیا جارہا ہے جو عمل تم کیا کرتے تھے"۔

سورۃ التحریم کی چھٹی آیت میں ایک مسلمان خاندان کے سربراہ کی ذمہ داری مثبت انداز میں امر کے صیغے میں بیان کی جارہی ہے۔ مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب میں یہ مضمون دو مواقع پر پہلے بھی بیان ہو چکا ہے۔ سورۃ التغابن میں اہل ایمان کو خبردار کیا گیا :

﴿ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ ﴾ "اے

اہل ایمان! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولادوں میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں' پس ان سے ہوشیار رہو" ـــــ اگرچہ ہماری اجتماعی زندگی کا جو نقشہ ہے اس کی بنیاد میں مال و اولاد کی طبعی محبت ہی کارفرما ہے۔ یہ محبت اپنی جگہ صحیح اور درست ہے' لیکن بسا اوقات یہ طبعی و فطری محبت حد اعتدال سے تجاوز کر کے اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ انسان اپنے اہل و عیال کی محبت کی وجہ سے اللہ کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر بیٹھتا ہے۔ بیویوں کی فرمائشیں پوری کرنے' اولاد کو اچھے سے اچھا کھلانے پلانے اور ان کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے لئے انسان حرام میں منہ مارنے لگتا ہے۔ گویا یہ محبت نتیجہ کے اعتبار سے اس کے لئے محبت نہیں بلکہ عداوت بن جاتی ہے اور اس کی عاقبت کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتی ہے ـــــ اس آیت میں اسی حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں اسی فطری محبت کا ذکر ایک مثبت انداز سے ہوا ہے۔ ایک بندۂ مومن کے دل میں یہ فطری تمنا ہوتی ہے کہ اس کے اہل و عیال بھی ایمان' اسلام' تقویٰ اور احسان کی روش اختیار کریں۔ یہ تمنا اور آرزو اس قرآنی دعا کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝ ﴾ (الفرقان : ۷۴)

"جو دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ "اے ہمارے رب' ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا"۔

یہی مضمون سورۃ التحریم کی زیر نظر آیت میں اپنی منطقی انتہا کو پہنچ رہا ہے۔ یعنی ایک مسلمان کی ذمہ داری صرف اتنی نہیں ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کے نان نفقہ کا اہتمام کرے' انہیں کھلائے پلائے' ان کے رہن سہن کی ضرورتیں پوری کرے۔ یہ تو جبلی طور پر ہر انسان کرتا ہے۔ ایک خاندان کے سربراہ کے مومن و مسلم ہونے کا نتیجہ یہ نکلنا چاہئے کہ اللہ نے اپنی مخلوق میں سے جن کو بطورِ امانت اس کے حوالے کیا ہے وہ ان کے صحیح حقوق کی ادائیگی کی فکر کرے ـــــ اس امانت کا حق اس طرح ادا ہو گا کہ ان کی بہتر سے بہتر دینی تربیت کی کوشش کرے تاکہ وہ صحیح رُخ پر پروان چڑھیں۔ لیکن اگر اسے

اس ذمہ داری کا احساس نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ ایک مسلمان خاندان کا سربراہ اپنی ذمہ داری کو بحیثیت ایک مسلمان ادا نہیں کر رہا۔

اس طرف متوجہ کرنے کیلئے قرآن مجید کا انداز بڑا فطری ہے۔ تنبیہ کا آغاز ﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْآ اَنْفُسَکُمْ﴾ "اے اہل ایمان بچاؤ اپنے آپ کو" کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں قیامت کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے کہ اُس روز ہر ایک کو اپنی فکر پڑی ہو گی۔ اُس وقت ہر شخص بھول جائے گا کہ کون میرا بیٹا ہے، کون میری بیوی ہے اور کون میرا باپ ہے! سورۂ عبس میں آتا ہے ﴿فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ○ یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ○ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِیْهِ○ وَصَاحِبَتِهٖ وَ بَنِیْهِ○﴾ "آخر کار جب وہ کان بہرے کر دینے والی آواز ہو گی ____ اُس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا"۔ اور سورۃ المعارج میں فرمایا گیا کہ

﴿وَلَا یَسْئَلُ حَمِیْمٌ حَمِیْمًا○ یُّبَصَّرُوْنَهُمْ، یَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ یَفْتَدِیْ مِنْ عَذَابِ یَوْمِئِذٍ بِبَنِیْهِ○ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِیْهِ○ وَفَصِیْلَتِهِ الَّتِیْ تُؤْوِیْهِ○ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثُمَّ یُنْجِیْهِ○﴾ (المعارج : ۱۰-۱۴)

"اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لئے اپنی اولاد کو، اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو اور اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیر اسے نجات دلا دے"۔

اسی لئے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ "بچاؤ اپنے آپ کو"۔ اور اس کے بعد اپنے قریب ترین افراد یعنی اہل خانہ، جن سے انسان کو بہت محبت ہوتی ہے، کو اس آگ سے بچانے کی ہدایت کی جا رہی ہے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔

اس سورۂ مبارکہ کے خاص اسلوب سے اس آیت کا جو ربط و تعلق ہے اسے اس مقام پر نوٹ کر لیجئے۔ ہر سورۂ مبارکہ کا ایک عمود یعنی ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے جس کے ساتھ سورت کی ہر آیت منسلک اور مربوط ہوتی ہے۔ یہاں بھی دیکھئے کہ اولاد کی

تربیت میں بسا اوقات لاڈ پیار حائل ہو جاتا ہے جو اولاد کے بگاڑ کا سبب بن جاتا ہے ــــ آپ بچے کی صبح کی میٹھی نیند میں خلل ڈالنا نہیں چاہتے' اس لئے اسے فجر کی نماز وقت پر ادا کرنے کا عادی نہیں بنا رہے۔ آپ کا دل چاہتا ہے کہ وہ سوتا رہے۔ اب اگر آپ کی اس بے جا شفقت و محبت کے نتیجے میں وہ بچہ بعد میں نماز کا پابند نہ ہو سکا تو آپ خود سوچئے کہ آپ نے اس کے حق میں کتنے کانٹے بو دیئے ہیں۔ اس کی تربیت اس طرح کس تباہی کے رخ پر ہو رہی ہے اور اس کی زندگی عاقبت کے اعتبار سے کس خسارے کی راہ پر گامزن ہو رہی ہے۔ اسی طرح اگر اپنی بیویوں کے ساتھ لاڈ پیار اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ اللہ کے احکام میں خلل پیدا ہو رہا ہے' حدود اللہ ٹوٹ رہی ہیں' اللہ کا تقویٰ نگاہوں سے اوجھل ہو رہا ہے اور اس سے دل غافل ہو رہا ہے تو اچھی طرح جان لیجئے کہ آپ کی طرف سے آپ کی یہ محبت نہ آپ کے حق میں نافع ہے اور نہ ان کے حق میں' بلکہ یہ دونوں کے لئے عداوت ہے۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے نبی اکرم ﷺ نے ایک نہایت جامع قاعدہ کلیہ ارشاد فرمایا ہے ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ)) ”تم میں سے ہر شخص کی حیثیت ایک چرواہے کی ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنے ریوڑ کے بارے میں جواب دہ ہے“۔ جس طرح ایک چرواہا اور گلہ بان ان مویشیوں کی حفاظت کا ذمہ دار اور مسؤل ہوتا ہے جو اس کے چارج میں دیئے گئے ہیں اور اس میں سے اگر کوئی جانور گم ہو جائے یا حادثہ کا شکار ہو جائے تو اس چرواہے کا محاسبہ ہوتا ہے کہ اس جانور کی گم شدگی میں اس کی غفلت کا کتنا دخل ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں ہر انسان کے حوالے اپنی مخلوق میں سے کچھ افراد کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی کسی دفتر میں افسر ہے تو جو اس کے ماتحت ہیں' وہ گویا ایک گلہ ہے جس کا وہ نگہبان ہے۔ اس کو اپنی حیثیت کے تناسب سے اپنے ماتحتوں کے دین و ایمان اور ان کی سیرت و کردار کے بارے میں فکر مند رہنا چاہئے کہ یہ چیزیں صحیح رُخ پر رہیں' کیونکہ وہ ذمہ دار اور مسؤل ہے ــــ اور خاندان کے سربراہ پر تو یہ اصول صد فیصد راست آتا ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے لئے ذمہ دار اور مسؤل ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ اپنے گھرانے کی قریب ترین خواتین کو لے کر بیٹھتے تھے اور ایک ایک کا نام لے کر انہیں نصیحت فرماتے تھے۔ مثلاً اپنی لختِ جگر نورِ نظر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا :

"اے فاطمہ! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی لختِ جگر! اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی فکر کرو۔ اس لئے کہ اللہ کے ہاں تمہارے باب میں مجھے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے"۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا :

"اے صفیہ 'اللہ کے رسول کی پھوپھی! اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی فکر کرو' اس لئے کہ اللہ کے ہاں تمہارے بارے میں مجھے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے"۔

تو یہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا متوجہ کرنے 'خبردار کرنے اور ترغیب و ترہیب کا انداز۔ ہر مسلمان گھرانے کے سربراہ کا یہ وہ مثبت رول ہے جسے اپنے اہل و عیال کے ضمن میں ادا کرنے کے لئے اسے فکرمند رہنا چاہئے۔

اب دیکھئے کہ یہ بڑا لطیف اور بلیغ انداز اختیار فرمایا گیا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو اس آگ سے بچانے کی فکر کرو جس کی شدت کا یہ عالم ہے کہ اس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ پتھروں کا ذکر قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ انسان جب جہنم میں جھونکے جائیں گے تو گویا وہ اس کا ایندھن ہوں گے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ پتھروں کے ذکر میں کیا حکمت ہے! غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذکر اس اعتبار سے بھی ہو سکتا ہے کہ اس آگ کی شدت و حرارت کو ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ایک آگ تو وہ ہے جو لکڑیوں سے جلائی جاتی ہے اور ایک آگ وہ ہے جو پتھروں سے جلے گی۔ پتھر کے کوئلوں سے کسی زمانہ میں جو آگ جلا کرتی تھی اس کی حرارت کا ذرا تصور کیجئے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر سوچئے کہ اصل پتھر جس آگ کا ایندھن بن رہے ہوں' اس کی تندی و تیزی اور شدت کا کیا عالم ہو گا! ـــــ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ بُت عموماً پتھروں سے تراشے جاتے ہیں اور انہیں معبود سمجھا جاتا ہے' ان پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں' ان کے آگے ماتھا ٹیکا جاتا ہے' ان سے حاجت روائی کے لئے دعائیں

کی جاتی ہیں' اس لئے مشرکوں کے ساتھ پتھروں کے یہ بُت بھی جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے تاکہ ان کی حسرت میں مزید اضافہ ہو کہ جنہیں ہم معبود سمجھے بیٹھے تھے وہ بھی ہمارے ساتھ اس آگ میں جل رہے ہیں۔

آگے فرمایا : "اس جہنم پر وہ فرشتے مامور ہیں جو بڑے سخت دل اور تُند خو ہیں"۔ غور کیجئے' بہت ہی لطیف انذار ہے کہ آج تم بڑی محبت' شفقت اور رلاڈ پیار کی وجہ سے اپنی اولاد کو بگاڑ رہے ہو' لیکن نتیجہ کے طور پر وہ ان تُند خو اور سخت گیر فرشتوں کے حوالہ ہوں گے جو جہنم کے کارندے اور داروغے ہیں اور ان کے دلوں میں کوئی نرمی اور محبت نہیں ہے۔ تمہاری یہ چہیتی اولاد کتنی ہی فریاد کرے ان فرشتوں کے دل پسیجیں گے نہیں۔ ان کے دل میں رحم اور رأفت کا جذبہ رکھا ہی نہیں گیا۔ وہ بڑے سخت دل اور تند خو ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ "وہ اللہ کی طرف سے ملنے والے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے۔ اور وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم ملتا ہے"۔

ان آیات سے فرشتوں پر ایمان کے بارے میں بھی رہنمائی ملتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ فرشتوں پر ایمان ہمارے ایمانیات کا لازمی حصہ ہے۔ دنیا میں دیویوں اور دیوتاؤں کے تصورات درحقیقت "فرشتوں پر ایمان" ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس تصور میں بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ فرشتوں کو بااختیار سمجھ لیا گیا۔ قرآن مجید واضح کرتا ہے کہ اگرچہ ملائکہ ایک نوری مخلوق ہیں اور ان کا رتبہ بہت بلند ہے لیکن وہ بااختیار مخلوق نہیں۔ اسی بات کو یہاں ان الفاظ مبارکہ سے واضح کیا گیا کہ ﴿لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ﴾ جب یہ حقیقت سامنے آگئی تو اب ان کو پکارنا بیکار' ان سے دعا کرنا لاحاصل اور ان کو پوجنا بے فائدہ ـــــ لہٰذا اللہ کو پکارو' اللہ سے دعا کرو' اللہ سے مدد مانگو۔ اللہ تعالیٰ جس ذریعے سے چاہے آپ کی ضرورت پوری کردے۔ وہ کسی انسان کے دل میں ڈال دے' کسی فرشتہ کو مامور کردے' یہ اس کا اختیارِ مطلق ہے۔ فرشتے اس اعتبار سے ایک مجبور اور ناچار مخلوق ہیں کہ وہ اپنے ارادہ واختیار سے کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ اس کی بڑی خوبصورت وضاحت سورۂ مریم میں آئی ہے۔ متعلقہ آیت کے بین السطور سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت جبریلؑ سے شکوہ کیا کہ اے جبریل! آپ وقفہ وقفہ سے

آتے ہیں' ہمیں انتظار رہتا ہے۔ اس شکوہ کا حضرت جبریلؑ سے اللہ تعالیٰ نے جواب دلوایا کہ ﴿ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ○ ﴾ "اے نبی! ہم آپ کے رب کے حکم کے بغیر نہیں اترا کرتے۔ جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے ہر چیز کا مالک وہی ہے' اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں ہے"۔ یعنی نزول وحی میں وقفہ کسی بھول کے باعث نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی حکمت بالغہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔

اگلی آیت میں نقشہ کھینچا گیا کہ جب لاڈ پیار سے بگڑے ہوئے تمہارے یہ لاڈلے اور پیارے جہنم میں جھونکے جائیں گے تو اس وقت وہ معذرتیں کریں گے' دہائیاں دیں گے اور چیخ و پکار کریں گے تو ان کو جواب دیا جائے گا ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ﴾ "اے ناشکرو! آج بہانے مت بناؤ' معذرتیں نہ تراشو"۔ اب اس کا کچھ حاصل نہیں۔ ﴿ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ ﴾ "تمہیں بدلے میں وہی کچھ دیا جا رہا ہے جو تم کرتے تھے" یہ تمہارے اپنے اعمال ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ دنیا میں ان میں لذت اور سرور تھا۔ وہاں تمہاری بداعمالیاں "SUGAR COATED PILLS" کی حیثیت رکھتی تھیں' جس کے باعث ان کی تلخی تم پر نمایاں نہیں ہوتی تھی اور جس انجام سے تمہیں دوچار ہونا تھا وہ تم پر واضح نہیں ہوتا تھا۔ تم نے اپنے افعال پر اپنی خواہشات نفس کی COATING کر رکھی تھی' اب وہ اُتر گئی ہے' لہٰذا اس کی حقیقی و واقعی تلخی کا مزا ہے جو تم یہاں چکھ رہے ہو۔ یہ تمہارے وہی اعمال ہیں جو آج تمہارے سامنے آ گئے ہیں۔ یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی اور تمہارے اپنے کرتوت ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس انجام بد سے ہم سب کو بچائے۔ آمین!

تَوْبَةً نَّصُوْحًا کا ہمارے دین میں مقام

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۚ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يَوْمَ

لَا يُخْزِى اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْلَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○ (آیات ۸'۹)

"اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کی جناب میں خالص توبہ۔ امید ہے کہ تمہارا پروردگار تم سے تمہاری برائیوں کو دُور فرما دے گا اور تمہیں ان باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔ اُس دن اللہ ہرگز رُسوا نہ کرے گا' نہ اپنے نبی کو اور نہ ان کے ساتھی اہل ایمان کو۔ ان کا نور دوڑتا ہوا ہو گا ان کے سامنے بھی اور ان کے داہنی جانب بھی ـــــ اور وہ یہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے لئے ہمارے اس نور کو پورا فرما دے اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرما' یقیناً تجھے ہر شے پر قدرت اور ہر کام پر اختیار حاصل ہے۔ اے نبی (ﷺ) کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے"۔

ان میں سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ تمام اہل ایمان کو توبہ کا حکم دے رہے ہیں' یا یوں کہہ لیجئے کہ توبہ کی ترغیب دے رہے ہیں۔ لیکن توبہ وہ ہو جو خالص توبہ ہو' جو خلوص دل سے کی گئی ہو' جو صحیح معنی میں توبہ ہو۔ ہمارے اس سلسلۂ درس میں سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کے ضمن میں توبہ کے موضوع پر بڑی مفصل گفتگو ہو چکی ہے۔ توبہ کا فلسفہ' توبہ کی عظمت' ہمارے دین کی حکمت میں اس کا مقام اور توبہ کے صحیح ہونے کے لئے شرائط جیسے تمام امور زیر بحث آ چکے ہیں۔

موقع کی مناسبت سے میں یہاں ایک حدیث کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ حدیث حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس کی ایک تو متفق علیہ روایت ہے یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے جبکہ ایک ذرا تفصیلی روایت صرف مسلم شریف میں ہے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ نے اس بات کو واضح فرمانے کے لئے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے کسی بندے کی توبہ سے کتنی خوشی ہوتی ہے' ایک تشبیہ بیان کی ہے۔ آپؐ نے

فرمایا کہ ایک ایسے شخص کا تصور کرو جو کسی لق و دق صحرا میں تنہا سفر کر رہا ہے' اس کے پاس ایک اونٹنی ہے' اسی پر اس کا زادِ راہ یعنی راشن اور پانی وغیرہ ہے۔ وہ تھوڑی دیر ستانے کے لئے کسی درخت کے سایہ تلے بیٹھتا ہے' اونٹنی بھی پاس ہی کھڑی ہے۔ وہاں پر اس کی آنکھ لگ جاتی ہے۔ اسی اثناء میں اس کی اونٹنی غائب ہو جاتی ہے۔ جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ دیوانہ وار اونٹنی کی تلاش میں کبھی اِدھر دوڑتا ہے' کبھی اُدھر بھاگتا ہے۔ اس کے اضطراب اور بیتابی کا آپ خود تصور کر سکتے ہیں' اس لئے کہ وہ اونٹنی ہی درحقیقت اس کے لئے وسیلۂ حیات اور ذریعۂ زندگی ہے۔ وہی اس کی سواری ہے' اسی پر اس کا کھانا اور پانی ہے۔ وہ ہر چہار طرف بھاگ دوڑ کرنے کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ موت کے انتظار میں آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اچانک وہ آنکھیں کھولتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اونٹنی اس کے سامنے کھڑی ہے۔ اس پر وہ اپنی خوشی کی شدت کے باعث ایسا بوکھلا اٹھتا ہے کہ کہنا تو یہ چاہتا ہے کہ "اے اللہ! تو میرا رب ہے' میں تیرا بندہ ہوں" لیکن فرطِ جذبات سے اس کی زبان لڑکھڑاتی ہے اور اس سے الفاظ نکلتے ہیں "اے پروردگار! میں تیرا رب ہوں' تو میرا بندہ ہے"۔ تصور کیجئے کہ اونٹنی دوبارہ پا لینے پر اس شخص کی فرطِ مسرت کا کیا عالم ہے! نبی اکرم ﷺ یہ تشبیہ بیان کر کے ارشاد فرماتے ہیں کہ "اللہ کو اس سے بھی زیادہ خوشی اپنے کسی گنہگار بندے کی توبہ سے ہوتی ہے"۔ احادیث میں توبہ کی جو عظمت بیان ہوئی ہے اور جس قدر شد و مد کے ساتھ اس کی ترغیب دی گئی ہے اسے سامنے رکھئے اور پھر اس آیت کا مطالعہ کیجئے کہ تمام مسلمانوں سے' خواہ وہ کسی زمان و مکان سے تعلق رکھتے ہوں' خطاب فرمایا جا رہا ہے ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا﴾ "اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کی جناب میں خالص توبہ"۔

توبہ کے ضمن میں دو مزید احادیث بھی پیشِ نظر رہنی چاہئیں' جن میں نبی اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں خود روزانہ ستر ستر اور سو سو بار اللہ کی جناب میں توبہ اور استغفار کرتا ہوں۔ ایک روایت صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' اس کے الفاظ ہیں ((وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ فِی الْیَوْمِ اَکْثَرَ مِنْ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً)) "اللہ کی قسم! میں روزانہ ستر مرتبہ سے زیادہ اللہ کی جناب میں استغفار بھی کرتا ہوں' توبہ

بھی کرتا ہوں"۔ دوسری روایت صحیح مسلم میں ہے جس کی رو سے نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں ((تُوْبُوْا اِلٰی رَبِّکُمْ فَوَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَتُوْبُ اِلٰی رَبِّیْ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی مِائَۃَ مَرَّۃٍ فِی الْیَوْمِ)) "اے لوگو! اپنے پروردگار کی جناب میں توبہ کرو' اس لئے کہ میں خود اپنے پروردگار کے حضور روزانہ سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں" ـــــ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی توبہ کے کیا معنی ہیں؟ حضورؐ سے کسی گناہ کے ارتکاب کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں۔ لہٰذا اچھی طرح جان لیجئے کہ نبی اکرم ﷺ کی توبہ اور آپ کے استغفار کا معنی و مفہوم کیا ہے! ـــــ دراصل توبہ کے معنی ہیں رجوع کرنا' پلٹنا' لوٹنا۔ اس کے کم سے کم چار درجے اگر ذہن میں رکھے جائیں تو بات واضح ہو جائے گی۔ ایک شخص وہ ہے جو کفر سے توبہ کرتا ہے اور اسلام میں آتا ہے۔ ایمان لانا بھی ایک نوع کی توبہ ہے۔ جیسے ہم سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں پڑھ آئے ہیں ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا﴾ دوسری توبہ کسی مسلمان شخص کی ہے جو معصیت سے توبہ کرتا ہے' گناہ کو چھوڑ رہا ہے۔ گناہ سے رجوع کر رہا ہے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اطاعت کی طرف۔ تیسری توبہ ہو گی اَبرار یعنی نیکو کاروں کی۔ کسی وقت ایک صالح اور نیک شخص کی قلبی کیفیت ایسی ہو سکتی ہے کہ معرفت الٰہی کے معاملے میں اس کے دل پر کچھ دیر کے لئے غفلت کا پردہ سا پڑ جائے۔ وہ محض غفلت ہے' اس سے کسی معصیت کا ارتکاب نہیں ہوا۔ اسے محض یہ احساس ہوا کہ میرے قلب پر کچھ دیر کے لئے غفلت کا حجاب طاری رہا ہے۔ اب وہ غفلت سے استحضار اللہ فی القلب کی جانب رجوع کر رہا ہے' دل میں اللہ کی یاد کو مستحضر کرنے کے لئے اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو رہا ہے' یہ بھی توبہ ہے ـــــ پھر ایک توبہ مقربین بارگاہ الٰہی کی ہے۔ یعنی ان کے قلب کا جو مضبوط تعلق اور رابطہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ استوار رہتا ہے' اس کی شدت میں اگر کبھی کوئی کمی محسوس ہوتی ہے تو اس حساسیت کے باعث وہ اس سے بھی توبہ کرتے ہیں اور اپنے تعلق مع اللہ کی اسی سابقہ شدت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ کیفیت جس کو مقربین یعنی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی توبہ میں شمار کیا جا سکتا ہے کہ جب ان نفوس قدسیہ کو یہ محسوس ہو کہ کسی مصروفیت کے باعث ان کے تعلق مع اللہ کی شدت میں ذرا سی بھی کمی ہو گئی ہے تو وہ

اس سے بھی توبہ کرتے اور رجوع فرماتے ہیں۔

اس تناظر میں آپ سمجھئے کہ کوئی صاحب ایمان ایسا نہیں ہے جو اس حکم یا اس ترغیب کا مخاطب نہ ہو کہ ﴿یٰاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْاتُوْبُوْٓااِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا﴾ "اے ایمان والو! اللہ کی جناب میں توبہ کرو خالص توبہ"۔ خالص توبہ کونسی ہو گی؟ اس کے متعلق عرض کی کیا جا چکا ہے کہ کم از کم تین شرطیں پوری ہوں تو وہ خالص توبہ ہو گی۔ اگر حقوق اللہ کے ضمن میں کوتاہی ہوئی ہے تو شدید پشیمانی ہو، مصمم ارادہ ہو کہ میں آئندہ اس کا ارتکاب نہیں کروں گا اور انسان اس گناہ کے کام کو فی الواقع چھوڑ دے۔ اور اگر حقوق العباد کا معاملہ ہے تو مزید ایک شرط یہ ہو گی کہ یا تو اس شخص سے جس کی حق تلفی کی ہے معافی حاصل کرے یا اپنے کسی عمل سے اس کے نقصان کی تلافی کرے۔

اس خالص توبہ کا مقام اور مرتبہ کیا ہے! اسے اسی آیت میں آگے بیان فرمایا: ﴿عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ﴾ عربی زبان میں عَسٰی اور لَعَلَّ کے الفاظ عام طور پر تو "شاید" کے معنی میں آتے ہیں۔ لیکن قرآن مجید میں جب یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو کر وارد ہوتے ہیں تو شاہانہ اندازِ کلام کی رُو سے اس کے معنی ہوتے ہیں "تاکہ" اور "امید ہے کہ" یعنی اس میں بشارت کا پہلو ہوتا ہے۔ لہٰذا ترجمہ یہ ہو گا کہ "امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری برائیوں کو دور فرما دے گا" ﴿وَیُدْخِلَکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ﴾ "اور تمہیں ان باغات میں داخل فرمائے گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی"۔

آگے فرمایا کہ اُس دن یعنی قیامت کے روز سب کے لئے رسوائی ہو گی، صرف انبیاء کرام علیہم السلام، ان کے پیروکار اور سب سے بڑھ کر النبی الخاتم جناب حضرت محمد ﷺ اور ان کے ساتھی اہل ایمان اس رسوائی سے بچے ہوئے ہوں گے: ﴿یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ﴾ آگے فرمایا: ﴿نُوْرُھُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَبِاَیْمَانِھِمْ﴾ "ان کا نور ان کے سامنے اور ان کی داہنی طرف دوڑتا ہو گا" ــــــ یہ بات جان لیجئے کہ انسان کے ایمان کا محل و مقام اس کا قلب ہے۔ ایمان حقیقت میں ایک روشنی ہے، ایک نور ہے۔ یہ بات ہم سورۃ النور کی آیتِ نور کے حوالے سے پہلے اچھی طرح سمجھ بھی چکے

اس سے بھی توبہ کرتے اور رجوع فرماتے ہیں۔

اس تناظر میں آپ سمجھئے کہ کوئی صاحب ایمان ایسا نہیں ہے جو اس حکم یا اس ترغیب کا مخاطب نہ ہو کہ ﴿یٰاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْاتُوْبُوْآاِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا﴾ ”اے ایمان والو! اللہ کی جناب میں توبہ کرو خالص توبہ“۔ خالص توبہ کونسی ہو گی؟ اس کے متعلق عرض کی کیا جا چکا ہے کہ کم از کم تین شرطیں پوری ہوں تو وہ خالص توبہ ہو گی۔ اگر حقوق اللہ کے ضمن میں کوتاہی ہوئی ہے تو شدید پشیمانی ہو' مصمم ارادہ ہو کہ میں آئندہ اس کا ارتکاب نہیں کروں گا اور انسان اس گناہ کے کام کو فی الواقع چھوڑ دے۔ اور اگر حقوق العباد کا معاملہ ہے تو مزید ایک شرط یہ ہو گی کہ یا تو اس شخص سے جس کی حق تلفی کی ہے معافی حاصل کرے یا اپنے کسی عمل سے اس کے نقصان کی تلافی کرے۔

اس خالص توبہ کا مقام اور مرتبہ کیا ہے! اسے اسی آیت میں آگے بیان فرمایا : ﴿عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ﴾ عربی زبان میں عَسٰی اور لَعَلَّ کے الفاظ عام طور پر تو ”شاید“ کے معنی میں آتے ہیں۔ لیکن قرآن مجید میں جب یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو کر وارد ہوتے ہیں تو شاہانہ اندازِ کلام کی رُو سے اس کے معنی ہوتے ہیں ”تاکہ“ اور ”امید ہے کہ“ یعنی اس میں بشارت کا پہلو ہوتا ہے۔ لہٰذا ترجمہ یہ ہو گا کہ ”امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری برائیوں کو دور فرمادے گا“ ﴿وَیُدْخِلَکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ﴾ ”اور تمہیں ان باغات میں داخل فرمائے گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی“۔

آگے فرمایا کہ اُس دن یعنی قیامت کے روز سب کے لئے رسوائی ہو گی' صرف انبیاء کرام علیہم السلام' ان کے پیرو کار اور سب سے بڑھ کر النبی الخاتم جناب حضرت محمد ﷺ اور ان کے ساتھی اہل ایمان اس رسوائی سے بچے ہوئے ہوں گے: ﴿یَوْمَ لاَ یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ﴾ آگے فرمایا : ﴿نُوْرُھُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَ بِاَیْمَانِھِمْ﴾ ”ان کا نور ان کے سامنے اور ان کی داہنی طرف دوڑتا ہو گا“ ـــــ یہ بات جان لیجئے کہ انسان کے ایمان کا محل و مقام اس کا قلب ہے۔ ایمان حقیقت میں ایک روشنی ہے' ایک نور ہے۔ یہ بات ہم سورۃ النور کی آیتِ نور کے حوالے سے پہلے اچھی طرح سمجھ بھی چکے

ہیں۔ اس قلب میں جو نورِ ایمان ہے' وہ میدانِ حشر میں ظاہر ہو جائے گا اور اس کی روشنی انسان کے سامنے پڑے گی ـــــ اسی طرح انسان کے نیک اعمال میں بھی ایک نورانیت ہے۔ البتہ اس دنیا میں ان کا ظہور نہیں ہوتا' میدانِ حشر میں ان کا ظہور ہو گا۔ نیک کاموں کا کمانے والا عام طور پر انسان کا داہنا ہاتھ ہوتا ہے' لہٰذا میدانِ حشر میں انسان کے نیک اعمال کا نور اس کے داہنی جانب نمایاں ہو گا ﴿ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِم ﴾ "دوڑتا ہو گا ان کا نور ان کے آگے اور ان کی داہنی طرف" ﴿ وَيَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ﴾ "اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! (اگر ہمارے نور میں کچھ کمی رہ گئی ہے تو) ہمارے لئے ہمارے نور کو پورا کر دے اور ہم کو معاف کر دے"۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میدان حشر میں یہ نور ہر شخص کو اس کے مقام اور مرتبہ کے اعتبار سے ملے گا۔ ایمان کے بھی مدارج و مراتب ہیں۔ ایک ایمان حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے اور ایک ہما شما کا ایمان ہے۔ ان کے مابین ظاہر ہے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اگر ہمیں ایمان کی ذرا سی رمق بھی میسر ہو تو وہ بھی ہمارے لئے بہت بڑی کامیابی ہے۔ کہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نورِ ایمان ! اور کہاں ہمارا ایمان ـــــ ! حضور ﷺ نے فرمایا کہ اُس روز میدانِ حشر میں لوگوں کو جو نور ملے گا تو کسی کا نور اتنا ہو گا کہ جیسے وہ مدینہ میں ہو اور اس کی روشنی صنعاء (یمن کے دارالحکومت) تک پہنچ جائے اور کسی کا نور بس اس قدر ہو گا کہ اس کے قدموں کے سامنے روشنی ہو جائے۔ جن کو اُس روز اتنا نور مل جائے وہ بھی بڑے نصیب والے اور کامیاب و کامران لوگ شمار ہوں گے کیونکہ وہ اس کٹھن اور سخت مرحلہ سے گزر جائیں گے جس سے آگے ان کی منزل مراد یعنی جنت ہے۔ کم نور والوں کے نور کی حیثیت گویا اس ٹارچ کی روشنی کی سی ہو گی جس کو لے کر انسان کسی پگڈنڈی پر چل تو لیتا ہے۔ پس اس کٹھن مرحلہ کے لئے فرمایا کہ وہ لوگ دعا کر رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! ہمارے نور میں ہماری کوتاہیوں کے باعث کمی رہ گئی ہے' پس تُو ہمارے اس نور کا اِتمام فرما دے اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما' ہمیں بخش دے۔ یہ ہمارے گناہ ہیں جن کی وجہ سے ہماری نورانیت میں کمی رہ گئی ہے' تو اپنے خاص خزانۂ فضل سے اپنے خصوصی اختیار سے اس کمی اور تقصیر کی

تلافی فرما دے' اس لئے کہ ﴿ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴾ "یقیناً تجھے ہر شے کا اختیار حاصل ہے"۔

اس کے بعد اگلی آیت میں نبی اکرم ﷺ سے خطاب ہے اور بظاہر یہ آیت اس سورت کے مضامین سے غیر متعلق سی معلوم ہوتی ہے۔ ابھی تک ساری باتیں حضور ﷺ کے گھر والوں سے متعلق' اہل ایمان سے متعلق اور مسلمانوں کے عائلی نظام سے متعلق تھیں' لیکن یہاں یہ بات فرمائی گئی کہ ﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ ﴾ "اے نبی! (ﷺ) آپ کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے" وہ آپ کی نرمی' آپ کی مروت' آپ کی شفقت اور آپ کی رحمت عمومی سے فائدہ اٹھانے نہ پائیں۔ وہ تو غلظت اور سختی کے مستوجب ہو چکے ہیں۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

یہ آیت بعینہٖ انہی الفاظ کے ساتھ سورۃ التوبہ میں بھی وارد ہوئی ہے۔ سورۃ التوبہ کی یہ ۷۳ ویں آیت ہے۔ سورۃ التحریم کے مضامین سے اس آیت کا بڑا لطیف ربط ہے۔ دراصل اس سورۂ مبارکہ کا مرکزی مضمون (Axis) یہ ہے کہ نرمی' شفقت' دلجوئی' کسی کے جذبات کا لحاظ اور پاس کرنا یہ فی نفسہٖ تو بہت اچھی ہیں' بہت مطلوب اور پسندیدہ ہیں' لیکن اگر ان میں حد اعتدال سے تجاوز ہو جائے تو یہ چیز مختلف پہلوؤں سے خرابیاں پیدا ہونے کا سبب بن سکتی ہے۔ اولاد کے ساتھ بے جا لاڈ پیار اور بے جا نرمی کا معاملہ ہو تو اس کے بے راہ اور آوارہ ہو جانے کا خطرہ ہے۔ وہاں بھی نرمی مطلوب تو ہے لیکن ایک حد تک۔ اسی طرح جب انسان اپنے نفس کے معاملہ میں نرمی کرتا ہے تو خرابی کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ چونکہ ہمارا دین 'دینِ فطرت ہے' لہٰذا اس میں ہمارے اوپر اپنے نفس کے حقوق بھی معین کئے گئے ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے ((وَ اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَیْكَ حَقًّا)) "اور بے شک تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے"۔ اس پر بے جا سختی پسندیدہ نہیں ہے۔ ہمارے دین میں رہبانیت جائز نہیں ہے ((لَا رَهْبَانِیَّةَ فِی الْاِسْلَامِ)) 'ہمارے دین میں نفس کشی کی اجازت نہیں ہے' بلکہ ضبط نفس کی ہدایت ہے کہ اپنے نفس کو کنٹرول میں رکھو۔ لیکن نفس کو بالکل کچل ڈالنا پسندیدہ نہیں ہے۔ اس